ISSN Online: 2709-7625
ISSN Print: 2709-7617
Vol.5 No.1 2022

فہم قرآن میں علم الآثار(Archaeology) سے استشہاد کی ضرورت واہمیت

IMPORTANCE OF ARCHAEOLOGY TO SEEKING THE KNOWLEDGE OF QURAN

*Dr. Muhammad Saeed Ahmad
**Usama Siddiqi
***Shafique Ur Rahman

ABSTRACT:

The Holy Quran has narrated the various aspects of the nations who have undergone trial, tribulations and wrath from Allah. It has dual aspects for us. One, it has a didactic as well as learning aspect for us. The Quran has also narrated the nations upon which Allah's wrath appeared and it has expressed about the nations who were rewarded by Allah.

The downfall, or collapse and ruin of these areas and people were due to the moral perversion and ethical degeneration. It is also the purpose of the Quran to look into the archaeology of the nations in order to find out the guidance for the coming generation. Now days this technique or art has taken the form of a new science which is called archeology .Due to the scientific aspect of the subject it's discoveries are keenly observed.It has been revealed with the discovery of these aspects that we come to know about the various Quranic truths.Due to the new discoveries of science& technology, many new sciences and discipline are emerging.

Every coming day is revealing the fact that the Quran is the Word of Allah and it is being proved by archaeology when it showed the downfall and wrath which took place upon these people and areas.

قرآن مجید کے اندر متعدد اقوام کے قصص منقول ہیں۔ مغضوب قوموں کے حوالے سے ان قصص کا مقصود عبرت اور موعظت ہے۔ تاکہ قیامت تک آنے والے انسان ان اقوام کے آثارِ باقیہ سے عبرت حاصل کرکے ہدایت کی طرف پلٹ آئیں۔ اس لیے نافرمان قوموں کے ساتھ معاملہ کرتے ہوئے ان کی سزاؤں کو اللہ نے مومنین ومتقین کے لیے ذریعۂ موعظت بنادیا ہے۔

ارشاد ربانی ہے:فَجَعَلْنَاهَا نَكَالًا لِمَا بَيْنَ يَدَيْهَا وَمَا خَلْفَهَا وَمَوْعِظَةً لِلْمُتَّقِينَ"[1]

(پھر ہم نے اس واقعے کو اس زمانے کے اور اس کے بعد کے لوگوں کیلئے عبرت اور ڈرنے والوں کیلئے نصیحت کا سامان بنادیا)

قرآن مجید میں منعمین اور مومنین کے احوال کا بیان ہے، جن پر اللہ تعالیٰ کی اطاعت وفرمانبرداری کے صلے میں انجام واجر کے ودعدے اور سکون وطمانیت کی عطا ہے بالعموم قرآن پہلوبہ پہلو مومنین اور مجرمین کے احوال بیان کرتا ہے ایک کے لیے سزا کے تازیانے ،زلزلے اور بستیوں کا اجڑنا ہے۔ یہ احکام الٰہی کے منکر اور انبیاء کرام وعقیدہ آخرت کے مکذبین ہیں۔ان پر اللہ کی پکڑ،غصہ اور عتاب وعقابِ الٰہی کا ذکر ہے۔ یہ افراد بھی ہیں اور اقوام بھی ہیں، جیسے قومِ عاد، قومِ

*Assistant Professor, Islamic Studies, Government Islamic graduate College, Railway Road, Lahore .saeedatiflahore@gmail.com

**Assistant professor,Govt.Islamia Graduate College,Lahore.

Email, usamasiddiqipk@gmail.com

***lecturer Government Islamia graduate College Railway road Lahore.

shafiqzaid86@gmail.com

ثمود، اصحاب الاخدود، اصحاب الایکہ، اصحاب الفیل وغیرہ وہ مغضوب افراد واقوام ہیں، جو دستِ اجل کے غضب وقہر کانشانہ بنیں، اللہ نے انہیں، ان کی نافرمانی کے سبب، جڑوں سے اکھیڑ دیا۔ قرآنِ مجید میں ایسی اقوام کے احوال کو بیان کیا گیا ہے کہیں مفصل اور کہیں رمز وکنایہ میں۔

قصص قرآنیہ کے مقاصد:

قرآن مجید کا اسلوب یہ ہے کہ جہاں بھی عبرت وموعظت کی جتنی ضرورت پڑی، اسی قدر حصہ بیان کر دیا گیا۔ اوراسی طرح نافرمان اقوام پر، ان کی سرکشی کے سبب اللہ کے عقاب کے منظر کشی بھی کی گئی ہے۔[2] یہ اوراس طرح کی دیگر آیات سے، ہمیں اس کائنات میں اللہ کی طرف سے جاری قانونِ عروج وزوال کا علم بھی ہوتا ہے۔ اورانسان اس سے عبرت وموعظت حاصل کر کے اپنے موجودہ رویے کو درست کر سکتا ہے۔

قرآن مجید نے جن نافرمان اقوام کو عذاب سے دوچار کیا اس سے پہلے وہاں پیغمبروں کے ذریعے اتمام حجت فرمائی، نصیحت وتنبیہ کا سلسلہ مسلسل چلتا رہا۔[3] پھران اقوام کو عذاب سے پہلے ان کی فرد جرم سنائی گئی اور بتایا گیا کہ تمہارے استکبار، فساد فی الارض، قساوتِ قلبی اور فسق وفجور کے سبب یہ عذاب تم پر مسلط کیا جارہا ہے۔ وقت کے انبیاء ورسل اس پیغام الٰہی کی مسلسل تذکیر کرتے رہے۔ ان مقدس ہستیوں کی تردید وتکذیب کے بعد ہی عذاب الٰہی کا کوڑا ان اقوام پر برستا تھا۔ وَمَا كُنَّا مُعَذِّبِينَ حَتَّى نَبْعَثَ رَسُولًا"[4] ان سرکش اقوام کے قصص، عبرتوں کا ایک جہاں اپنے اندر لیے ہوئے ہیں۔ ایک مفسر عبرت کی اس داستان کی طرف توجہ دلاتے ہیں۔

> "یہ ظاہر ہے کہ ایام ووقائع کے ذکر سے مقصود بعض مقاصد کے لیے استشہاد تھا اور یہ استشہاد جب ہی موثر ہو سکتا تھا کہ جن ایام ووقائع کا ذکر کیا جائے ان کے وقوع سے مخاطب بے خبر نہ ہوں۔ کم از کم ان کی بھنک کانوں میں پڑ چکی ہو۔ یا نہ پڑی ہو تو اپنے پاس کے آدمیوں سے حال پوچھ لے سکتے ہوں۔ ورنہ ظاہر ہے کہ لوگ کہہ دیتے پہلے ان وقائع کا وقوع ثابت کرو، پھر ان سے ہمیں عبرت دلانا۔ اوراس طرح عبرت وتذکیر کا سارا مقصد ہی فوت ہو جاتا"۔[5]

اللہ کی کتاب نے ان اقوام کے آثار کی طرف توجہ دلوائی ہے جو اہل عرب کے لیے اجنبی نہ تھے۔ وہ ان اقوام کی تاریخ سے بخوبی آگاہ تھے۔ اوران اقوام کے آثار قریش واہل عرب کے اسفارِ تجارت کے راستے میں پڑتے تھے۔ اس لیے ان سے موعظت وعبرت خیزی آسان تھی۔ اسی لیے اقرآن مجید نے ان قصصِ عبرت سے استشہاد کیا ہے، اورانہیں اولاً اہلِ عرب اور پھر پوری دنیا کے لیے حصول عبرت کا ذریعہ قرار دیا ہے۔

قصص کی اس عبرت پذیری سے جو قوم محروم ہو جائے وہی اللہ کے عذاب کی مستحق بنتی ہے۔ قرآن مجید نے خطۂ عرب کی اقوام کا ذکر فرمایا تاکہ وہ عرب میں بسنے والی ان سابقہ اقوام کے آثار کو دیکھ کر عبرت حاصل کریں۔ انسان کی فطرت کے اندر اللہ نے عبرت پذیری کا مادہ رکھا ہے۔ تمرد واستکبار کے سبب جب تک یہ فطرت بگڑتی نہیں یہ مادہ برقرار رہتا ہے۔ یہ مغضوب قومیں عرب اقوام کی اصل تھیں اس لیے اللہ نے کسی اور جگہ یا قوم کا ذکر کرنے کے بجائے انہی اقوام کا ذکر کیا تاکہ پہلے مرحلے میں اہل عرب عبرت حاصل کریں اور پھر دوسرے مرحلے میں بیان للناس (قرآن) کے ذریعے کل انسانیت ان مغضوب اقوام کے آثار سے عبرت حاصل کر سکے۔ مولانا آزاد ان آثار کی جغرافیائی کیفیت وموزونیت اور تاریخِ عرب کے اندر اس کی اہمیت سے متعارف کرواتے ہوئے لکھتے ہیں:

> "اب دیکھو قرآن نے جن ایام ووقائع کا ذکر کیا ہے وہ تمام ترکن خطوں میں واقع ہوئے تھے؟ ان کی جغرافیائی حدود کیا ہیں؟ یہ تمام وقائع یا تو خود عرب میں ہوئے یا سرزمین دجلہ وفرات میں یا پھر فلسطین اور مصر میں، اور یہ تمام خطے ایک دوسرے سے متصل تھے تجارتی قافلوں کی شاہراہوں پر تھے۔ پس قرآن نے انہیں خطوں کا ذکر کیا جو فی الحقیقت تاریخ اقوام کا ایک ہی وسیع خطہ رہ چکا ہے۔ دوسرے خطوں سے تعرض نہیں کیا کیونکہ مخاطبین کے لیے ان خطوں کا ذکر ان کی شب وروز کی باتوں کا ذکر تھا اور وہ جھٹلانے کی جرأت نہیں کر سکتے تھے۔"[6]

قرآنی تذکیر کا یہ معروف انداز ہے کہ وہ گردوپیش کی مثالوں سے انسان کو حق کی طرف متوجہ کرتا ہے۔ یہاں بھی اسی سنت اللہ کا اہتمام کیا گیا ہے۔ مولانا حنیف ندوی اس حکمت قرآنی کی مزید توضیح کرتے ہیں کہ ان اقوام کے قصص کا کیوں انتخاب کیا گیا:

- تاہم اس کتاب ہدیٰ کا اصل موضوع تاریخ بیان کرنا نہیں ہے، بلکہ اس کا اصل موضوع یہ ہے کہ اقوام وملل اور اشخاص وافراد کے بارے میں صرف انھیں گوشوں کو بے نقاب کیا جائے جن میں عبرت پذیری اور نصیحت آموزی کا کوئی نہ کوئی اشارہ پایا جاتا ہے۔ یا جس سے کسی نہ کسی غلط فہمی کا زالہ ہوتا ہے، اور واقعہ کی نئی تعبیر فکر و نظر کے سامنے آتی ہے۔" [7]

قرآنی اسلوب براہ راست فطرتِ سلیمہ کے حامل لوگوں (متقین) کو متوجہ کرتا ہے کہ وہ اللہ کی نافرمان قوموں کے احوال سے عبرت حاصل کر کے اپنے عقیدہ اور اعمال کو درست رکھیں۔ اس لیے وہ گرد و پیش کے مغضوب آثار کو بطور دلیل پیش کرتا ہے۔

" وَ كَمْ اَهلَكْنَا قَبْلَهُمْ مِّنْ قَرْنٍ هُمْ اَشَدُّ مِنْهُمْ بَطْشًا فَنَقَّبُوْا فِي الْبِلَادِ ۭ هَلْ مِنْ مَّحِيْصٍ "[8]

(اور ان سے پہلے ہم کتنی قوموں کو ہلاک کر چکے ہیں جن کی طاقت پر گرفت ان سے زیادہ سخت تھی چنانچہ انہوں نے سارے شہر چھان مارے تھے کیا ان کیلئے بھاگنے کی کوئی جگہ تھی؟)

اس لیے ان کو سرزمین عرب کے آثار کی طرف متوجہ فرمایا۔ اسی کی طرف ان کی تجارتی قافلے چلتے تھے۔ ان ہی قدیم اقوام سے اہل عرب اپنا تاریخی و نسبی تعلق جوڑتے تھے۔ ان ہی اقوام کی کہانیاں وہ بچپن سے سنتے تھے اور ان کی تاریخ سے ان کے کان اور دماغ بخوبی آشنا تھے۔ اس تناظر میں قرآنِ مجید نے ان کے سامنے دیکھی بھالی حقیقتوں کو بیان فرمایا۔

مولانا ابوالکلام آزاد اس پہلو کو بیان کرتے ہیں:

"عرب خود ان کا ملک تھا۔ عراق سے ان کے تعلقات تھے۔ فلسطین کے کھنڈروں پر ہر سال گزرتے رہتے۔ مصر ان کے تجارتی قافلوں کی منڈی تھی۔ ان ملکوں کا نام سننا گویا اپنے چاروں طرف نظر اٹھا کر دیکھ لینا تھا۔ پھر جن قوموں کا ذکر کیا گیا ان کے ناموں سے بھی وہ ناآشنا نہ تھے۔ قوم تبع اور اصحاب اخدود، یمن سے تعلق رکھتے تھے اور یمن عرب میں ہے۔ عاد اور ثمود کی بستیاں بھی عرب ہی کے حدود میں تھیں۔ قبیلہ مدین بالکل عرب کے پڑوس میں تھا قوم لوط کے کھنڈر، ان میں سے سینکڑوں اپنی آنکھوں سے دیکھ چکے تھے۔ سرزمین دجلہ و فرات کی قوموں اور ان کی روایتوں سے بھی ناآشنا نہیں ہو سکتے تھے۔ مصر میں گو مصر کے فرعون اب نہیں رہے تھے۔ لیکن مصر میں برابر آتے جاتے رہتے تھے۔ فراعنہ کے نام ان کے لیے اجنبی نام نہیں ہو سکتے تھے۔"[9]

یہ تو رہا مقامات و آثار مغضوبہ کا معاملہ پھر اہل عرب کو انبیاء کی تاریخ سے بھی مناسب آگہی تھی۔ مزید تفسیر کے لیے وہ یہودی علماء سے رجوع کرتے اور اپنی معلومات میں اضافہ کرتے رہتے تھے۔ اللہ نے انبیائے بنی اسرائیل کی داعیانہ مساعی کو بیان کیا اور ساتھ ہی مدعو قوم کے معاندانہ طرز عمل پر روشنی ڈالی، اور ان وجوہ کو اہلِ عقل کے سامنے رکھا جن کی وجہ سے یہ اقوام اللہ کے غضب کا شکار ہوئی تھیں، یہی وہ اسباب و عوامل تھے جن کا نتیجہ تباہی و بربادی کی صورت میں نکلنا تھا۔ ان اقوام کے یہ تہذیبی آثار تھے جو اطراف عرب میں موجود تھے اور عربوں کے تجارتی قافلے اور اہل دانش اس کی معلومات کے لیے کوشاں رہتے تھے۔ مولانا آزاد لکھتے ہیں:

"علاوہ بریں یہودی اور عیسائی خود ان کے اندر بسے ہوئے تھے۔ انبیائے بنی اسرائیل کے نام ان لوگوں کی زبانوں پر تھے، تفصیلات ربیوں اور راہبوں کو معلوم تھیں۔ یہ ان سے پوچھ سکتے تھے اور پوچھا کرتے تھے۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ قرآن نے ایام و وقائع کے بیان واستدلال میں جابجا اس طرح کا اسلوب اختیار کیا ہے جیسے ایک جانی بوجھی ہوئی بات کی طرف اشارہ کیا جائے۔ مثلاً جابجا فرمایا: أَلَمْ يَأْتِكُمْ نَبَأُ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِكُمْ[10] (جو قومیں تم سے پہلے گزر چکی ہیں کیا تم تک ان کی خبریں نہیں پہنچ چکی ہیں؟)[11]

اللہ تعالیٰ نے پہلے درجے میں ان آثار باقیہ کو عرب قوم کے لیے نصیحت و تذکیر کا ذریعہ بنایا۔ یہ آثار نہ تو مستور تھے اور نہ ہی دور دراز خطے میں۔ اہل عرب ان مقامات سے بخوبی آشنا تھے۔ اس لیے قرآن کا انداز استفہامیہ ہے۔ کہ کیا تمہیں ان مغضوب اقوام کے آثار سے آگہی نہیں؟۔ یہ انداز غافلوں کو جھنجھوڑ دینے والا ہے۔ اور فطرت سلیمہ کے حامل افراد کو حق کی دعوت اور حصول عبرت کی طرف متوجہ کرنے والا ہے۔

تفسیر قرآنی میں اس موضوع کی اہمیت:

فہم قرآن کے اثری تناظر میں دیکھے تو ہمیں علم الآثار(Archaeology)سے اس کی اہمیت کا احساس ہوتا ہے کہ آج کے دور میں بالخصوص اس فن سے استفادہ کرکے ہم دنیا پر قرآن کی حقانیت وفوقیت ثابت کرنے کے ساتھ ساتھ انہیں ہدایت کے لیے بھی راہ یاب کرسکتے ہیں۔اس ضمن میں "منقولات" کی قدر وقیمت کی تلقین کے ساتھ ساتھ اس علم سے بے اعتنائی کی کیفیت پر اولاً افسوس کا اظہار کرتے ہیں اور ثانیاً اس کی اہمیت کا احساس دلاتے ہوئے سید سلیمان ندویؒ لکھتے ہیں:

> "اس موضوع کی اہمیت اور ضرورت سے شاید کسی مسلمان کو انکار نہ ہوگا۔ قرآن مجید میں عرب کے بیسیوں قوموں، شہروں اور مقامات کے نام ہیں جن کی ہر قسم کی صحیح تاریخ نہ صرف عوام بلکہ علماء تک ناواقف ہیں اور نہایت عجیب بات ہے کہ تیرہ سو برس میں ایک کتاب بھی مخصوص اس فن پر نہیں لکھی گئی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک طرف خود مسلمانوں کو ان حالات سے ناواقفیت رہی اور دوسری طرف غیروں کو انہیں افسانہ(Legend)کہنے کی جرأت ہوئی۔"[12]

سید سلمان ندویؒ اس "علمی نوحے" کے ذریعے اہلِ علم کو جھنجوڑتے ہیں اور ساتھ ہی مغربی ماہرینِ علم الآثار(Archaeologist)کی علمی قربانیوں اور مشکل اسفار کا ذکر کرتے ہیں۔ پھر اس فن پر اہل مغرب کی تحقیق دقیقہ رسی اور جانکاہی کو علمی خراج پیش کرتے ہوئے اس کا تذکرہ فرماتے ہیں:

> "مقام عبرت ہے کہ ہماری مذہبی کتاب کی تحقیق وکاوش میں بھی اغیار نہایت کوشش وجانفشانی سے مصروف ہیں، جرمن، فرنچ، اٹالین اور انگلش مستشرقین نے "تاریخ اسلام" پر محققانہ کتابیں لکھیں۔ یونانی دردمانی تصنیفات سے جو عرب قبل اسلام کے حالات سے پر ہیں، انتخاب وخلاصہ کیا۔ قرآن مجید نے جن اقوام وبلاد کا ذکر کیا ہے ان کے کھنڈروں کا مشاہدہ کیا، ان کے کتبات کو حل کیا اور ان سے عجیب وغریب نتائج مستنبط کئے۔"[13]

آپ اس تاریخ وآثاری استفادے کی جانب توجہ دلاتے ہیں اور اہل مغرب کے تعصب وبغض کی بھی ساتھ ساتھ نشاندہی کرتے ہیں کہ ان کے ان تحقیقی نتائج کو من وعن قبول کرنے کے بجائے بہت ہوشیار اور چوکنے ہو کر "خذ ما صفا دع ما کدر" کے اصول پر نگاہ رکھنی از بس ضروری ہے وگرنہ اخذ نتائج کی "اثریاتی لغزش" کا صدور بھی ممکن ہے۔ اس لیے وہ ان مغربی محققین علم الآثار کی مساعی کی قدر کرتے ہوئے ان کے دین اسلام سے بغض کو بھی واضح کرتے ہیں۔ بتاتے ہیں کہ یہ محققین ان تحقیقات کے ضمن میں کس طرح غلط فہمیاں پیدا کرتے ہیں:

> "وہ مسلمان نہیں، یہودی یا عیسائی ہیں، انہوں نے نہایت بے دردی سے قرآن کے فوائد کو پامال کیا ہے۔ بعض متعصب مستشرقین نے ان معلومات کو غلط طور سے قرآن کی مخالفت میں استعمال کیا ہے۔ اٹھارویں صدی کے وسط میں ریونڈ فارسٹر(Forster)نے عرب کا تاریخی جغرافیہ(Historical Geography of Arab)لکھا جس میں اس نے اپنی جہالت کے عجیب وغریب نمونے پیش کئے جن کو پڑھ کر کبھی ہنسی اور کبھی رونا آتا ہے۔"[14]

> "نولڈیکے(Noldeke)نے عمالقہ وعاد کی تحقیق میں ایک رسالہ لکھا ہے جس میں ثابت کیا ہے کہ یہ غیر تاریخی قومیں ہیں۔ ولکن(A.welken)اور روبرٹس سمتھ(Roberts Smith)عرب کے ادعائے نسب کا انکار کرتے ہیں۔"[15]

ان مغربی محققین کے علمی عناد کو واضح کرتے ہیں اور بتاتے ہیں کہ ان کی پھیلائی ہوئیں غلط فہمیوں کے نتائج کہاں تک پہنچ گئے ہیں۔ پھر آپ اس موضوع کے ضمن میں اہل علم کو ان کی ایک ذمہ داری کی طرف توجہ دلاتے ہیں:

> "ان آثار قدیمہ کے اکتشاف نے ادیان عرب قبل اسلام کے معلومات میں نہایت سخت انقلاب پیدا کر دیا ہے جن سے اسلام کے مناقب وفضائل کا ایک نیا باب پیدا ہو گیا ہے۔ بہر حال نہایت ضروری تھا کہ ہمارے دشمن جن جدید معلومات کو ہماری مخالفت میں صرف کر رہے ہیں ان سے اپنی موافقت کے پہلو پیدا کئے جائیں"[16]

پھر مولانا یہاں بہت تاسف کے ساتھ مثالیں دیتے ہوئے آج کے اہلِ علم کو اس موضوع کی طرف متوجہ کرتے اور انہیں کس دردمندی سے ان کی علمی توجہ مبذول کراتے ہوئے لکھتے ہیں:

"عہد قدیم میں مخالفین کے اعتراضات کا نشانہ اعتقادات تھے لیکن اس عصر جدید میں جب ہمارے مخالفین عقائد اسلام کی مضبوطی کا امتحان کر چکے ہیں۔ انہیں نے یہاں سے ہٹ کر تاریخ و تمدن کے میدان میں مورچے قائم کیے ہیں۔ اب ضرورت ہے کہ جس طرح ایرانی و یہودی مؤرخین کے مقابلہ میں ابن حنیفہ دینوری المتوفی 281ھ ابن قتیبہ المتوفی 274ھ اور ابن جریر طبری المتوفی 310ھ نے اسلام اور قرآن کی تاریخ کی تحقیق و تطبیق میں کوشش کی، اس زمانہ میں جدید یورپین تاریخ اسلام و قرآن سے تطبیق دی جائے اور یورپین تاریخی تحقیقات وکتشافات کی غلطی کا پردہ چاک کیا جائے اور خود ان ہی کے کارخانوں کے بنے ہوئے ہتھیاروں سے ان کے حملوں کا جواب دیا جائے۔" [17]

اس لیے قرآنی علوم کے ایک طالب علم کو بہت چوکنا ہو کر ان علوم اور خاص کر آرکیالوجی کو قرآن کا خادم اور تابع سمجھ کر آیات کی تفسیر کرنی چاہیے۔ تاہم کسی مقام پر بھی ان تفصیلات کے سبب قرآن کا مقصود اصلی عبرت و موعظت نگاہوں کے سامنے رہے۔

آج کے مفسر کو دیگر ضروری دینی علوم اور عربیت کے علاوہ آثار قدیمہ سے بھی مناسب آگاہی ہونی چاہیے تاکہ وہ تفسیری ادب کے سلسلے کو آج کی "اثری دریافتوں" کے تناظر میں آگے بڑھا سکے۔ اوران کے ذریعے آج کے باخبر انسان کے سامنے آثارِ قدیمہ کو صداقت قرآنی کے استشہاد کے طور پر دنیا کے سامنے رکھا جاسکے۔ انسانی تاریخ کے تہذیبی سفر میں آثار قدیمہ کے کھنڈرات کی تباہی کی علل تلاش کر سکے۔

مفسر قرآن مولانا عبدالماجد دریا آبادی اس علم کے حوالے سے فرماتے ہیں:

"اگر صحیح نقطہ نظر اور ایمان و معرفت کے پہلو سے (آرکیالوجی کا) مطالعہ کیا جائے تو یہ بجائے خود ایک جہاد ہے۔" [18]

ایک اور مقام پر آپ لکھتے ہیں:

"اس میں تعلیم و ترغیب ہے کہ انسان پچھلی قوموں کے حالات سے عبرت و نصیحت حاصل کرے اور بڑی بڑی مہذب و بااقبال قوموں، سلطنتوں کے آثار اور مٹے ہوئے کھنڈروں سے سبق لے۔ نقطہ نظر صحیح اور توحیدی ہو جائے تو مسلمان طالب علم کے لیے جغرافیہ، تاریخ اور اثریات ان سارے علوم کا مطالعہ عبادت بن سکتا ہے۔" [19]

گویا فاضل مفسر اسے "فکری جہاد" اور "عبادت" قرار دے کر بتلا رہے ہیں کہ آج کے دور میں خاص طور پر اس فن کی کس قدر اہمیت ہے اور ہم آج آرکیالوجی کی مدد سے عالم کفر کے طالبان ہدایت کو قرآن مجید کی جانب رہنمائی کر سکتے ہیں۔ یہ بھی ایک "فکری جہاد" ہے اور "اعلائے کلمۃ اللہ" کی ایک صورت اور اس میں اپنی صلاحیتوں کا کھپانا بھی ایک طرح سے "عبادت" بن جاتا ہے۔

امام قرطبی کمال انداز سے آثارِ قدیمہ کی افادیت بتلاتے ہیں:

"سافروا فی الارض فانظروا واتخبرواالتصرفوا ماحل بالکفرة قبلکم من العقاب والیم العذاب وهذاالسفر مندوب الیه اذاکان علی سبیل الاعتباربآثارِ من الامم" [20]

(زمین میں سفر کرو پس دیکھو اور خبردار ہو جاؤ اس سزا اور دردناک عذاب سے جو تم سے پہلے کافروں پر اترا، اور یہ سفر اگر پچھلی امتوں کے آثارِ باقیہ سے عبرت حاصل کرنے کی غرض سے ہو تو مندوب ہے)

قرآن مجید کا یہ دنیائے علم پر احسان ہے کہ اس نے آثار ماضیہ کی طرف انسانیت کو متوجہ کیا اور ان آثار کو ضائع ہونے سے بچالیا۔

ابو حیان اندلسی اس ذیل میں لکھتے ہیں:

" وَأَنَّ النَّظَرَ الْمَأْمُورَ بِهِ، هُوَ نَظَرُ الْعَيْنِ وَأَنَّ الْأَرْضَ هِيَ مَا قَرُبَ مِنْ بِلَادِهِمْ مِنْ دِيَارِ الْهَالِكِينَ بِذُنُوبِهِمْ كَأَرْضِ عَادٍ وَمَدْيَنَ وَمَدَائِنَ قَوْمِ لُوطٍ وَثَمُودَ. وَقَالَ قَوْمٌ: السَّيْرُ وَالنَّظَرُ هُنَا لَيْسَا حِسِّيَّيْنِ بَلْ هُمَا جَوَلَانِ الْفِكْرِ وَالْعَقْلِ فِي أَحْوَالِ مَنْ مَضَى مِنَ الْأُمَمِ الَّتِي كَذَّبَتْ رُسُلَهَا، وَلِذَلِكَ قَالَ الْحَسَنُ: سِيرُوا فِي الْأَرْضِ لِقِرَاءَةِ القرآن أي: اقرؤوا الْقُرْآنَ وَانْظُرُوا مَا آلَ إِلَيْهِ أَمْرُ الْمُكَذِّبِينَ، ---وَقَالَ قَوْمٌ: الْأَرْضِ هُنَا عَامٌّ، لأن في كل قُطْرٍ مِنْهَا آثَارًا لِهَالِكِينَ وَعِبَرًا لِلنَّاظِرِينَ"[21]

(نظر سے مراد آنکھوں کی نظر ہے۔ اور زمین سے مراد ان کے نزدیک گناہوں کی وجہ سے ہلاک ہونے والوں کی زمین ہے، جیسے عاد، مدین اور مدائن قوم لوط اور ثمود کی زمین۔ اور بعض اہلِ علم کا کہنا ہے کہ یہاں سیر اور نظر سے مراد حسی نہیں بلکہ یہ انبیاء کو جھٹلانے والے امم سابقہ کی حالات میں عقل اور فکر سے عبرت حاصل کرنا ہے۔ اسی وجہ سے حسن نے کہا ہے: قرآن پڑھنے کے لیے زمین میں چلو، یعنی قرآن پڑھو جھٹلانے والوں کے انجام کو دیکھو۔ اور بعض نے کہا ہے: کہ یہاں پر زمین سے مراد عام ہے کیونکہ زمین کے ہر حصے میں ہلاک شدہ گان کے آثار اور دیکھنے والوں کے لیے عبرتیں ہیں۔)

اس تناظر میں دیکھیں تو معلوم ہوتا ہے کہ قرآن مجید نے علم الآثار کی طرف مسلمانوں اور عامۃ الناس کی توجہ مبذول کرائی۔ اس میدان میں مسلمانوں کے جذبہ علم کو مہمیز کیا اور مغضوب اقوام کے علاقوں اور بستیوں میں مسلمانوں کی دلچسپی بڑھتی چلی گئی۔

مفسرین اور علمائے اسلام نے علم الآثار کو کلیتاً نظر انداز نہیں کیا، البتہ ان کے ہاں عبرت پذیری کے حوالے سے ان آثار میں دلچسپی برقرار رہی۔ سیروا فی الارض کے ثمرہ فانظروا کیف کان عاقبة المکذبین کے سبب وہ ان آثار سے عبرت و نصیحت حاصل کرتے رہے۔ امت کی اس غیر منقطع اور متواتر دلچسپی کے سبب علم الآثار سے کسی نہ کسی درجہ میں ان کا تعلق برقرار رہا۔ اور وہ قرآنی ارشاد کی تکمیل میں ہر مغضوب قوم کے آثار کی طرف متوجہ رہے۔

علم الآثار: معنی، مفہوم اور تعریفات:

علم الآثار (Archaeology) کو جب بطور ایک منظم علم بنانے کے حوالے سے غور و خوض شروع ہوا تو اس میں ماہرین نے کوئی علاقائی تخصیص روا نہ رکھی۔ نہ اسے کسی خاص گوشے اور پہلو تک محدود رکھا بلکہ دنیا بھر میں موجود، آثار باقیہ، تہذیبی دریافتوں، اور علاقائی روایات تک کو اپنے وسیع دائرہ تحقیق کے اندر سمو لیا۔ انسانی طبائع، رجحانات، مختلف قسم کے ثقافتی انداز، اشیاء متعلقہ اشیاء، ظروف، لباس، عبادات کے طریقے، مذہبی رویے تک اس علم و فن کی وسعتوں میں سمٹتے چلے گئے۔ اس پہلو سے اس علم کی وسعت "مطالعہ انسان" ٹھہری اور بشریات (Anthropology) تک اس علم کی وسعت میں شامل ہو گئے۔ اثریات کے ماہرین نے مختلف جہات سے اس علم کی تعریفات کی ہیں۔

لفظ آرکیالوجی (Archaeology) اصل میں یونانی زبان کے لفظ Arkaiologia سے مشتق ہے جس کے معنی میں قدیم اشیاء کے متعلق ماہرانہ رائے دینا، عہدِ رفتہ کے آثار کا مطالعہ کرنا اور "قبل از تاریخ" کے باقیات کو منظم انداز سے دیکھنا ہے۔

انسائکلوپیڈیا آف برٹانیکا میں ہے کہ آرکیالوجی ماضی کی انسانی زندگی کے آثار و احوال کے سائنسی مطالعہ کا نام دیا گیا ہے یہی وجہ ہے کہ آرکیالوجی پر مبنی تحقیقات ماقبل تاریخ، قدیم اور ناپید ثقافتوں کا بنیادی ذریعہ علم سمجھی جاتی ہیں۔ ذیل کی تعریف اسی مفہوم کو ادا کرتی ہے۔

"Archaeology is the scientific Study of the material remains of past human life and activities... Archeological investigations are a principal source of Knowledge of prehistoric, ancient and extinct cultures[22]

انسانی ماضی کی سرگرمیاں جب اجتماعی شکل اختیار کرتی ہیں تو ان کے مطالعے کا انداز بھی ثقافتی اور تہذیبی حوالے سے کیا جاتا ہے

"ماضی کی ثقافتوں کا دریافتوں اور تجزیوں کے ذریعے اور انسانوں کی اپنی بنائی ہوئی اشیاء کا سائنسی تجزیہ کرنا علم آثار قدیمہ کہلاتا ہے۔[23]

ان تعریفات سے ہمیں پتہ چلا کہ علم الآثار مختلف الجہات علم ہے۔ جس کی وسعت بشریات، تاریخ اور دیگر علوم تک محیط ہے۔ بنیادی طور پر ماضی کے آثار کا فہم حاصل کرنا مقصود ہے۔ تاکہ اس کی بدولت انسانی زندگی کے اہم پہلو ہمارے علم میں آجائیں اور ہم اس کی مدد سے ماضی کی مکمل یا خاصی تفہیم حاصل کر سکیں۔

یہ حقیقت ہے کہ دور جدید میں علم الآثار نے پرانی چیزوں، مقامات کو نئے انداز سے دریافت کر کے اور محفوظ کر کے فنی لحاظ سے ہمارے سامنے رکھ دیا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جیسے قبل از تحریر (Before to write era) زمانے کی ایک ایک چیز ہمارے سامنے موجود ہے۔ اس کی مدد سے اس قدیم زمانے وعہد کو سمجھنا بہت آسان ہو گیا ہے۔ مثلاً قوم عاد، قوم ثمود اور مدائن صالح پر کس طرح کا عذاب آیا اس کی نوعیت کیا تھی۔ اس کے متعدد پہلو ہمارے سامنے بالکل نکھر کر سامنے آگئے ہیں۔ علم الآثار نے اس کو بہت ہی سائنسی اور عقلی انداز سے منظم و مرتب کر کے ہمارے سامنے پیش کر دیا ہے۔

فہم قرآن میں جدید اثری تحقیقات (Archaeological Research) سے استشہاد:

قرآن مجید نے عذاب الٰہی کے حوالے سے جن علاقوں اور اقوام کا ذکر کیا ہے ان سے اہل عرب بخوبی آشنا تھے اور اپنے تجارتی اسفار میں ان کھنڈرات سے گزرتے اور ان مغضوب جگہوں کو دیکھتے تھے۔ وہ بستیاں اگرچہ برباد و معذب ہو چکی تھیں اور موسموں کے تغیر نے ان آثار کے متعدد حصوں کو ڈھانپ کر عام انسانوں کی نظروں سے اوجھل کر دیا تھا۔ لیکن جدید علم الآثار نے اپنی سائنس کی بدولت ان علاقوں کو از سر نو پوری طرح دریافت کیا اور ان کی ایک ایک جگہ کی نشاندہی و تعین کر کے بتلایا کہ یہ آثار اپنے عہد میں کس طرح استعمال ہوتے تھے۔ اس تناظر میں جدید علم الآثار نے اپنی تحقیقات کی بدولت عبرت و موعظت کے متعدد مستور پہلو کھول کر رکھ دیے ہیں۔ مولانا ابوالکلام آزاد بہت دقت نظر کے ساتھ اس موضوع کے حوالے سے بتاتے ہیں:

> " قرآن نے جن خطوں کی اقوام کا ذکر کیا ہے دنیا کو ان کی قدیم تاریخ بہت کم معلوم تھی۔ اور خود عرب اور عربی نسل کی ابتدائی سرگزشتیں بھی پردۂ خفا میں مستور تھیں۔ لیکن اٹھارویں صدی سے **آثار قدیمہ** کی تحقیقات کا نیا سلسلہ شروع ہوا اور پھر انیسویں صدی میں نئے نئے پردے اٹھے اور اب بیسویں صدی کے **اثری انکشافات** روز بروز ایک خاص رخ پر جا رہے ہیں۔ ان سب سے عرب، عراق، فلسطین، شام اور مصر کی قدیم قوموں اور تمدنوں کے جو حالات منکشف ہوئے ہیں انہوں نے ان خطوں کی قدیم تاریخ کو بالکل ایک نئی شکل دے دی ہے اور روز بروز نئی نئی حقیقتیں ابھرتی جاتی ہیں"۔[24]

پہلے یہ عبرتیں عربوں کے اسفار تک محدود تھیں۔ جب وہ ان راستوں سے گزرتے تو ان مقامات کو دیکھ کر دلوں میں رقت پیدا ہو جاتی، جس کے نتیجے میں زندگیوں میں مثبت تبدیلیوں کا آغاز ہو جاتا۔ اب علم الآثار نے اپنے منظم اور نتیجہ خیز علم کے باعث اس دور کی معاشرت و رسوم کو ہمارے سامنے گویا زندہ کر کے رکھ دیا ہے۔ ماہرین نے ان آثار کو محفوظ کر کے اسے پوری دنیا کے لیے مقام عبرت بنا دیا ہے۔ قرآن مجید نے ان آثار کی طرف توجہ دلائی تو اس وقت ان کی حیثیت مقامی تھی آج مفسرین کے علاوہ بھی دنیا کی صالح فکر ان آثار سے استشہاد کرتی ہے اور قرآنی صداقتوں کے اقرار پر مجبور ہو جاتی ہے۔

مستشرقین کا قرآن مجید پر اعتراض اور علم الآثار کی روشنی میں اس کا جواب:

فہم قرآن میں جہاں دیگر ماخذوں سے راہنمائی لی جاتی ہے وہی اب ان میں ایک ضمنی ماخذ "علم الآثار" کا اضافہ ہو گیا ہے چنانچہ معاندین اسلام کی جانب سے قرآن مجید پر جو اعتراضات کیے گئے ان میں چند ایک کا تعلق علم الآثار سے ہے اور اب علم الآثار کی دریافتوں کے سبب اس اعتراض کا بہترین جواب میسر آگیا۔ اس کی ایک مثال پیش خدمت ہے۔ مولانا تقی عثمانی صاحب نے مستشرقین کا قرآن مجید پر ایک اعتراض نقل کر کے اس کا مشاہداتی و تاریخی جواب دیا ہے۔ ظاہری اعتراض یہ ہے:

> قرآن کریم نے فرعون کے ایک وزیر کا نام "ہامان" ذکر کیا ہے، حالانکہ اس نام سے فرعون کے کسی وزیر کا نام بائبل کے عہد نامۂ قدیم میں نہیں ملتا، مقالہ نگار نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ دراصل ہامان شاہ اسوریس کا وزیر تھا جس کا ذکر بائبل میں موجود ہے، آنحضرت ﷺ نے چونکہ یہ واقعات زبانی سیکھے تھے۔ اس لیے آپ ﷺ نے (معاذاللہ) مغالطے سے یہ نام فرعون کے وزیر کی طرف منسوب کر دیا۔[25]

اس اعتراض کے اہل علم نے متعدد شافی جواب دیئے ہیں جن میں مولانا تقی عثمانی بھی شامل ہیں۔ لیکن جدید علم الآثار کی قدیم دریافتوں نے اس مسئلے کو آرکیالوجی کے شواہد کی بنیاد پر بہترین طریقے سے حل کر دیا ہے۔ دریافت شدہ آثار کی تحریر شناسی سب سے مشکل مرحلہ تھا۔ ماہرین نے سخت محنتوں اور علامتوں کی

مدد سے قدیم مصری تحریر کو پڑھنے میں کامیابی حاصل کرلی۔ جس کے نتیجے میں مصری تہذیب کے بہت سے معاشرتی اور سیاسی پہلو سامنے آگئے، اور کئی تاریخی مغالطوں اورالجھنوں کو دور کرنے میں مدد ملی۔

قدیم مصری خط تصویر کا معما1799 میں ایک لوح یا تختی کی دریافت کے وقت حل ہوگیا تھا جسے "روزیٹالوح" (Rosetta Stone)کانام دیا گیا تھا۔[26]

اس کندہ شدہ تحریر کی اہمیت یہ تھی کہ یہ تین مختلف رسم الخط میں تھی: خط تصویر، پروہتی رسم الخط کی آسان شکل اور یونانی رسم الخط۔ یونانی رسم الخط کی مدد سے قدیم مصری تحریروں کو پڑھ لیا گیا تھا۔ معروف ترک محقق ہارون یحیٰ اس اعتراض کے تناظر میں علم الآثار سے استشہاد کرتے ہیں۔

> "ہامان" کانام اس وقت تک کسی کو معلوم نہ تھا جب تک انیسویں صدی میں مصری خط تصویر کو پڑھ نہیں لیا گیا تھا۔ جب یہ خط تصویر پڑھ لیا گیا تو یہ بات معلوم ہوئی کہ ہامان تو فرعون کا قریبی مدد گار اور مصاحب تھا۔ اسے فرعون نے "پتھر کی کانوں" کا سربراہ تعینات کر رکھا تھا۔ دراصل یہ بات بڑی اہمیت کی حامل ہے کہ قرآن میں ہامان کو ایک ایسے انسان کے طور پر پیش کیا گیا ہے جو فرعون کی کمان میں تعمیری کاموں کی نگرانی کرتا تھا۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ اس زمانے میں جب کسی کو بھی اس بات کا علم نہ تھا قرآن میں اس کا ذکر آچکا تھا۔ اس کندہ شدہ تحریر کا ترجمہ جس فرانسیسی نے کیا اس کا نام جین ایف شیمپولین تھا اس طرح ایک بھولی بسری زبان اور اس میں بیان کردہ واقعات سامنے آئے۔ یوں مصری تہذیب، مذہب اور سماجی زندگی کے بارے میں کافی معلومات حاصل ہوئیں۔ مصر کے خطِ تصویر کو جب پڑھ لینے میں کامیابی ہوگئی تو ایک اہم بات کا انکشاف ہوا: "ہامان" کانام مصری کندہ شدہ تحریروں میں مذکور تھا۔ یہ نام ایک یادگار میں استعمال ہوا تھا جو ویانا کے عجائب گھر میں رکھی ہوئی تھی۔"[27]

اب یہ اعتراض نہ رہا کہ "ہامان" فرعون کا وزیر نہ تھا بلکہ اس کا مشیر ہونا بھی ثابت ہوگیا۔ علم الآثار کی روشنی میں دئے گئے اس جواب نے مستشرقین کے اس اعتراض کو اس پہلو سے ہمیشہ کے لیے ختم کر دیا ہے۔ علم آثار قدیمہ کو اہل مغرب کے ہاں سائنس کا درجہ حاصل ہے اس لیے جب اس علم کے حوالے سے ان کے سامنے حقائق رکھے جاتے ہیں تو ان کے پاس ان آثاری حقائق کو تسلیم کرنے کے اور کوئی راستہ نہیں رہتا۔ اور اس طرح سے علم الآثار، علوم القرآن کے قابل فخر سلسلے میں ایک نیا خادم بن کر قرآن مجید کو اپنی مؤیدات پیش کرتا ہے۔

نتائج بحث:

آج کے دور میں فہمِ قرآنی میں، بطور ایک معاون علم کے، آرکیالوجی کا شمول ضروری ہوگیا ہے۔ کیونکہ قرآن کریم کی بیسیوں آیات کی عصری توضیح اثری تحقیقات(Archaeological Research) کی بنا پر ممکن ہے۔ قدیم مفسرین بھی مقدور بھر آثارِ قدیمہ سے استشہاد کرتے رہے، بلکہ امام قرطبی تو اس کے مطالعہ کو مندوب قرار دیتے ہیں۔

ارض القرآن کی مغضوب اقوام کی تہذیب اور ان کی معاشرت کے احوال پر تحقیق کے لیے ان کی عمارات، آلات اور ظروف واحوال پر غور وفکر کر کے نتائج کا استنباط کرنا چاہیے۔ جس سے ان کی معاشرت کی تصویر آنکھوں کے سامنے آجائے۔ پھر ان اقوام کی تباہی (گرفت الٰہی) کے اخلاقی وروحانی اسباب بھی تلاش کریں۔ اس کا حاصل یہ نکلے گا کہ علم الآثار کی ان دریافتوں کے نتائج اور قرآن کے جامع تبصروں میں حیرت انگیز مماثلت نظر آئے گی اور ان آثار میں تفکر کے نتائج سامنے آنے پر گردنیں اپنے خالق کے حضور جھک جائیں گی اور اسے مقصد زندگی کا شعور میسر آئے گا۔

یہ وہ علم ہے کہ آج کے سائنسی عہد میں تفسیر قرآنی اس کے بغیر پوری طرح ممکن نہیں۔ ہر قدیم مفسر نے اپنے عہد کے مطابق اس علم سے استفادہ کے ساتھ ساتھ استناد واستشہاد کیا ہے لیکن جس طرح آج کے عہد میں یہ ایک باقاعدہ سائنس بن چکا ہے۔ اب اسے نظر انداز کرنا کسی طور ممکن نہیں رہا۔ یہی وجہ ہے کہ گزشتہ صدی میں مفسرین نے اس علم سے کمیت اور کیفیت دونوں اعتبار سے وسیع استفادہ کیا ہے۔ اب ضرورت اس امر کی ہے کہ قرآن کو حاکم، مخدوم اور مطبوع سمجھتے ہوئے اس کی تفسیر میں اس مرتب ومدون علم (Archaeology) سے نتیجہ خیز استفادہ کیا جائے۔

حواشی وحوالہ جات

[1]-قرآن:البقرۃ:2: 66

2- كَذَّبَتْ ثَمُودُ وَعَادٌ بِالْقَارِعَةِ٤ فَأَمَّا ثَمُودُ فَأُهْلِكُوا بِالطَّاغِيَةِ٥ وَأَمَّا عَادٌ فَأُهْلِكُوا بِرِيحٍ صَرْصَرٍ عَاتِيَةٍ٦ سَخَّرَهَا عَلَيْهِمْ سَبْعَ لَيَالٍ وَثَمَانِيَةَ أَيَّامٍ حُسُومًا فَتَرَى الْقَوْمَ فِيهَا صَرْعَى كَأَنَّهُمْ أَعْجَازُ نَخْلٍ خَاوِيَةٍ٧ فَهَلْ تَرَى لَهُمْ مِنْ بَاقِيَةٍ٨ وَجَاءَ فِرْعَوْنُ وَمَنْ قَبْلَهُ وَالْمُؤْتَفِكَاتُ بِالْخَاطِئَةِ۔

قرآن کریم: الحاقة69: 4–9

1-قران مجید نے ان مغضوب اقوام کے آثار کو متعدد مقامات پر بطور نمونۂ عبرت کے پیش کیا ہے۔اس مقام پر ان اقوام کا مختصراً ذکر کر دیا ہے۔

دیکھیئے قرآن کریم:الشعراء:26: 105-106- 119- 123-124- 139- 160-162- 170-173

[4] -قرآن کریم:الإسراء:17: 15

[5] - آزاد،مولانا،ابوالکلام،ترجمان القرآن،ناشر اسلامی اکادمی 7اردو بازار لاہور ،ج2،ص274

[6] -حوالہ بالا ،ج2،ص274

[7] -ندوی،مولانا،حنیف اللہ،مطالعۂ قرآن،ناشر علم و عرفان پبلشرز،لاہور،2006ء ،ص229

[8] -قرآن کریم:ق:50: 36

9-ترجمان القرآن،ج2،ص274

[10] -قرآن کریم:ابراہیم:14:9

[11] -ترجمان القرآن،ج2،ص274،275

[12]-ندوی،سید سلیمان،مولانا، تاریخ ارض القرآن،دارالمصنفین شبلی اکیڈمی،اعظم گڈھ(ہند)،اپریل2014ء،ص11

[13]-تاریخ ارض القرآن،ص12

[14] -حوالہ بالا،ص12

[15] -حوالہ بالا،ص12

[16] - حوالہ بالا،ص13

[17] -حوالہ بالا،ص13

[18] -دریا آبادی،عبدالماجد،مولانا،تفسیر ماجدی، تاج کمپنی لمیٹڈ کراچی۔لاہور،2001ء،ص137

[19]-حوالہ سابق،ص281

[20] -قرطبی ، شمس الدين،محمدبن أحمد(المتوفى: 671هـ)،الجامع لأحكام القرآن،دار الكتب المصرية – القاهرة،1384هـ، ج2ص326

[21] -أثيرالدين، الأندلسي،أبوحيان، محمدبن يوسف(المتوفى: 745هـ)،البحر المحيط في التفسير،دار الفكر – بيروت،1420 هـ ، ج4،ص445

[22]- The new Encyclopedia Britannica, London 15 Edition vol1525

[23]- www.bitbucket.icaap.org

[24]- ترجمان القرآن، ص275

[25]- انسائکلوپیڈیا برٹانیکا مقالہ "قرآن" جلد 13، ص483، بحوالہ علوم القرآن، مفتی محمد تقی عثمانی صاحب، ناشر مکتبہ دارالعلوم کراچی 14، سن اشاعت ستمبر 2010ء، ص289

[26]- سنگ روزیٹا یا سنگ رشید ایک کالے سنگ مرمر کا چوکا حجر جو دریائے نیل کی ایک شاخ کے کنارے روزیٹا (یارشید) کے مقام پر 1799ء میں فرانسیسی فوج کے کارندوں کو اتفاقاً ملا۔ یہ بطلیموس پنجم کی یاد میں 196 ق م میں نصب کیا گیا تھا۔ اس میں ایک ہی عبارت تین زبانوں یعنی مصری تصویری خط میں، مصری عوامی خط میں اور یونانی خط میں کندہ ہے۔ 1822ء میں ایک فرانسیسی اسکالر ژان فرانسوا شمپولیون نے ان تین زبانوں کا تقابلی جائزہ لے کر مصری تصویری خط کی کلید ڈھونڈ نکالی۔ بعد میں دیگر اسکالروں نے اس کام کو پایہ تکمیل تک پہنچایا۔ اب اس مصری تصویری خط کو پڑھ کر مختلف مقبروں اور دیگر جگہوں سے قدیم مصر کے متعلق بہت سے معلومات حاصل کی گئی ہیں۔ اب یہ پتھر برطانیہ کے عجائب گھر میں موجود ہے۔

سنگ روزیٹاRosetta Stone.JPG: حجم: 1123 ملی میٹر × 757 ملی میٹر × 284 ملی میٹر (45 انچ × 28.5 انچ × 11 انچ

لکھائی: مصری تصویری خط، مصری عوامی خط اور یونانی خط۔ تخلیق: 196 ق م۔ دریافت: 1799ء۔ موجودہ مقام: برٹش میوزیم

www.wikypadia.com

[27]- یحیٰ، ہاورن، معجزاتِ قرآن، رمیل ہاؤس آف پبلی کیشنز، اقبال مارکیٹ اقبال روڈ، کمیٹی چوک راولپنڈی، 2008، ص78،79